Al-Hikmat
Volume 33 (2013) p.p. 1-25

وحدت الوجود، وحدت الشہود اور وحدتِ شاہدین (۲)

ڈاکٹر عبدالحفیظ فاضلی

پروفیسر / چیئرمین ریٹائرڈ، شعبہ فلسفہ جامعہ پنجاب، لاہور۔ پاکستان

خلاصہ

مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد ابتدائی صدیوں سے ہی روحانیت (Islamic Spirituality) کو اسلام کی روح کے عین مطابق سمجھتی چلی آرہی ہے؛ اسی طرح ہر زمانے میں ایسے لوگ بھی ہوئے ہیں جنہوں نے اسے اسلامی تعلیمات کے خلاف سمجھا ہے۔ اسلام میں روحانیت سے انکار کیا جائے یا اسے عین اسلام قرار دیا جائے، بات سند کے ساتھ ہو تو اس سے نور پھیلے گا، اگر اس کے بغیر ہو تو کنفیوژن پیدا ہوگا۔ قرآن پاک کے حوالے سے بات کرنا سند کے ساتھ بات کرنا ہے کہ اللہ نے اپنے نازل کردہ کلام کو 'الحق' فرمایا ہے اور حال پر یہ درجہ صرف اور صرف قرآن پاک کو حاصل ہے۔ قرآن پاک اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ ماضی میں اللہ کے نازل کردہ کلام میں تحریف ہو چکی ہے۔ لہٰذا اسے سند کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام میں روحانیت کی مختلف شکلوں کیلئے تصوف کا لفظ رائج ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ 'تصوف' یا 'صوفی' کا لفظ قرآنِ پاک میں کہیں آیا ہے اور نہ ہی کسی آیت سے اخذ ہوتا ہے۔ بعض لوگوں نے 'احسان' کو ایمان کا اعلیٰ ترین درجہ قرار دیکر اسلام میں روحانیت کا ماخذ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ہمارے علم کے مطابق یہ لفظ قرآنِ پاک میں کہیں بھی ماننے کے کسی درجے (level of believing) کیلئے نہیں آیا۔ اسی طرح اگر 'احسان' کو 'حسنِ عمل' کے مترادف قرار دے کر تصوف کو حسنِ عمل سکھانے کی طریقت کے معنوں میں 'احسان اسلام' قرار دیا جائے تو بات تب بھی نہیں بنتی۔ حضرت فضل شاہ اپنے وقت کے بہت بڑے روحانی بزرگ تھے۔ حضرت فضل شاہ اور آپ کے خلیفہ محترم محمد اشرف فاضلی، تفسیر فاضلی کے مصنف ہیں۔ تفسیر فاضلی قرآن پاک کے لفظ 'شاہد' کو اسلام میں روحانیت کا ماخذ قرار دیتی ہے۔ جسے عرف عام میں تصوف کہا جاتا ہے، تفسیر فاضلی کے مطابق اسے قرآن پاک کے حوالے سے بجا طور پر طریقت شاہدین کے نام سے موسوم کیا جانا چاہیے۔ طریقت شاہدین' عطائے تزکیہ اور تصدیق کی طریقت کا نام ہے۔ اہل روحانیت پر بدعت کا الزام بھی عائد کیا جاتا ہے۔ 'بدعت' (principle of innovation) قرآنی اصول ہے جو اجتہاد کو بنیاد فراہم کرتا ہے اور قرآن پاک کی مقرر کردہ حدود کے اندر انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کے جلا، انسانی فکر و تجربہ

کے حاصلات کوعلم الٰہی کے ساتھ relate کرنے، اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق اسلامی اصولوں کی نئی تعبیر اور نئے اداروں کو وجود میں لانے کیلئے ازبس لازم ہے۔مروجہ تصوف صدیوں سے 'وحدت الوجودی' اور 'وحدت الشھودی' مکاتب فکر میں تقسیم ہے۔دونوں مکاتب فکر اپنا نظریہ قرآن پاک کی سند سے پیش کرنے کے بجائے اپنے کشف و مشاہدہ کی بنیاد پر پیش کرتے ہیں۔کسی بھی نظریہ کے درست ہونے کیلئے اسکی قرآن پاک سے مطابقت لازم ہے۔تفسیر فاضلی، وحدت الوجود کو قرآن پاک کے حوالے سے درست نظریہ نہیں مانتی۔تاہم اس مکتب فکر میں بھی بعض بزرگ عشق رسول کے حوالے سے بہت اعلیٰ مقامات پر پائے گئے ہیں اس لئے یہی کہنا درست معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے عشق رسول کو قبول فرماتے ہوئے ان سے در گزر فرمالے تو اسے کوئی پوچھنے والا نہیں۔تفسیر فاضلی دین میں کسی نئے مکتب فکر کی بنیاد نہیں رکھنا چاہتی، تاہم لفظ 'شاہد' کو اسلام میں روحانیت کا ماخذ قرار دینے اور اپنے کشف و شہود کے بجائے قرآن پاک کی سند سے بات کرنے کو پیش نظر رکھتے ہوئے تفسیر فاضلی کے نقطۂ نظر کو 'وحدت شاہدین' کہنا موزوں معلوم ہوتا ہے۔درج ذیل مضمون میں اسلام میں روحانیت کے ماخذ اور حقیقت پر تفسیر فاضلی کا نقطۂ نظر قرآن پاک کی سند کے ساتھ تشکیل دیا گیا ہے۔

ذاتِ اقدس ﷺ کی حیثیتوں کا نظریہ

قرآنِ پاک اتباع اور اطاعتِ رسول کو مطلق قرار دیتا ہے۔اسکی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا اتباع کرنے والے کو اللہ اپنا محبوب بنا لیتا ہے اور آپ کی اطاعت کرنے والے کو انعام یافتہ بندوں کی صف میں شمار ہونے کا شرف ہوجاتا ہے۔لیکن اگر کوئی حضور پاک کی ذاتِ اقدس کو مختلف حیثیات میں تقسیم کرے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے رسول ہونے کو آپ کی ذاتِ اقدس کی محض ایک حیثیت قرار دے اور یہ کہے کہ آپ صرف اسی حیثیت میں واجب الاتباع اور واجب الاطاعت ہیں۔اور پھر یہ کہے کہ اس حیثیت میں بھی آپ کا اتباع اور اطاعت محض امورِ دین کے ساتھ مشروط ہے، امورِ دنیا اس میں شامل نہیں ہیں، تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا کیا اتباع اور اطاعت کرلیتا اگر حضور کے زمانۂ بعثت میں بھی ہوتا۔ ڈاکٹر اسرار احمد اپنے مضمون ''خلافت کے اقتصادی نظام کی اصولی اساس'' ۲۰ میں لکھتے ہیں کہ اللہ کا رسول ہونا آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ اقدس کی مختلف حیثیات میں سے ایک ہے۔بعض افراد کو آپ نے مختلف اوقات میں جو احکام دیئے، ضروری نہیں کہ وہ رسول اللہ کی حیثیت ہی میں دیئے ہوں۔مثلاً بعض ماننے والوں

کے آپ رشتہ دار تھے، بعض محترم خواتین کے آپ خاوند تھے، عرب کے ایک معزز قبیلہ کے معزز ممبر تھے، کمیونٹی کے ایک دانا شخص تھے۔ ان حیثیات میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کسی امر کی اطاعت یا اتباع لازم نہیں ہو سکتا۔ ہاں امورِ دین میں آپ کی اطاعت اور اتباع لازم ہے، اور اللہ کے مذکورہ بالا حکم کا یہی محل ہے۔ تفسیرِ فاضلی ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیثیتوں کے نظریہ کو خلافِ قرآن سمجھتی ہے۔ تفسیرِ فاضلی کے محترم مصنفین شاہد کی ذاتِ اقدس کی وحدت پر یقین رکھتے ہیں۔ شاہد صرف اور صرف شاہد ہوتا ہے۔ باپ، بیٹا، بیوی، رشتہ دار یا غیر رشتہ دار جو شاہد پر ایمان لاتا ہے، اسکا ہے، اور جو نہیں مانتا اسکا کچھ نہیں لگتا۔ یہ بات تمام شاہدین کے بارے میں درست ہے۔ شاہد کا مقام اس کی حیاتِ طیبہ کے تمام پہلوؤں پر محیط ہوتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا آپ کا ماننے والا نہیں تھا۔ قرآن شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وہ آپ کے اہل میں سے نہیں۔ (۱۱:۴۵) حضرت نوح اور حضرت لوط علیہم السلام کی بیویاں اور حضرت ابراھیم علیہ السلام کا باپ ان کے ماننے والے نہیں تھے، وہ آپ کے کچھ نہیں لگتے تھے۔ (۶:۷۸؛ ۹:۱۱۴؛ ۶۶:۱۰) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حکم کے لہجے میں بہت ہی کم بات کرتے تھے، آپ مشورے یا تجویز کے طور پر بات فرماتے تھے، تحریک یا ترغیب سے کام لیتے تھے تاکہ اطاعت نہ کر سکنے والا گناہگار نہ ہو۔ شاہدین کا بھی یہی طریقہ ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگِ احد کے موقعہ پر دڑے کے اوپر مقرر کئے جانے والوں کو کسی صورت وہاں سے نہ ہلنے کا حکم دیا، اس پر بھی عمل نہ کیا گیا۔

ذاتِ اقدس کی حیثیتوں میں تقسیم سے یہ لوگ کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں! یہ اپنی پسند اور ناپسند سے شدید طور پر جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ زندگی کے تمام پہلوؤں میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت اور اتباع کیلئے تیار نہیں ہوتے۔ کسی کو بڑے علم والا ماننے، اقتداء کے مقام پر فائز ہونے سے پہلے کسی رجوع لانے والے کا اتباع کرکے اس سے تصدیق پانے کا شرف حاصل کرنے کے لئے یہ تیار نہیں ہوتے، کیونکہ اس میں اپنی پسند اور ناپسند کے اتباع اور قیاس آرائیوں کیلئے گنجائش نہیں ہوتی۔ دنیا اور دین کو دو الگ دائرے متصوّر کرنے، اور رسالت کو صرف امورِ دین تک محدود کرنے میں، اپنی پسند اور ناپسند کا اتباع کرنے اور اپنی قیاس آرائیوں کو علم کا نام دینے کی انہیں وسیع گنجائش نظر آتی ہے۔ حضور کے اتباع اور اطاعت کے صریح امرِ الٰہی کو اپنی خواہشات کے مطابق بنانے کیلئے یہ ایک حدیث بیان کرتے ہیں۔ اس حدیث کے مطابق کھجور کی کاشت کرنے والے چند لوگ حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ حضور کی مدینہ پاک تشریف آوری سے پہلے ہم نر کھجور کے زردان (اینتھر) سے زردانے (پولن گرین) اتار کر مادہ درختوں کے زردان پر مَل دیا کرتے تھے اور

اسے کھجوروں کی شادی کا نام دیتے تھے۔لیکن جب یہ بات حضور کے سامنے رکھی گئی تو ہم نے سمجھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے ناپسند فرمایا ہے۔ہم نے اس پریکٹس کو ترک کر دیا۔لیکن حضور! کھجور کی فصل تو بہت ناقص ہوئی ہے۔حدیث مزید بیان کرتی ہے کہ اس پر حضور نے فرمایا: اَنتمُ الاَعلمُ باُمورِ دُنیاکُم (تم امورِ دنیا میں بڑے علم والے ہو۔)[۲۱]

تفسیرِ فاضلی کے مطابق یہ بات قرآنِ پاک کی تعلیمات کے قطعاً منافی ہے کہ کوئی شخص کسی قسم کے اُمور میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑے علم والا بھی ہوسکتا ہے۔آیئے اس روایت کی صحت کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں۔یہ روایت کچھ اُمور (affairs/matters) کو اُمورِ دنیا (mundane affairs, worldly matters) قرار دیتی ہے، اور اس بات کا اثبات کرتی ہے کہ ان اُمور میں لوگ (معاذ اللہ) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑے علم والے ہوسکتے ہیں۔اُمورِ دنیا کے بعد جو اُمور بچتے ہیں انھیں اُمورِ دین (religious matters) ہی کہا جائے گا۔چنانچہ اس روایت کو درست ماننے والے اُمور کو اُمورِ دنیا اور اُمورِ دین میں تقسیم کرتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت اور اتباع محض اُمورِ دین کے ساتھ مشروط ہے۔بعض لوگ اس روایت کو بنیاد بنا کر علم کو سیکولر علم اور مذہبی علم میں تقسیم کر کے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم کو صرف مذہب سے متعلق اُمور کے علم تک محدود کرتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اتباع صرف مذہبی اُمور میں لازم ہے، سیکولر علم سے متعلق معاملات پر اس حکم کا اطلاق نہیں ہوتا۔[۲۲] تفسیرِ فاضلی اس تقسیم کو درست نہیں سمجھتی۔تفسیرِ فاضلی کے مطالعہ سے اخذ ہوتا ہے کہ قرآنِ پاک میں اس تقسیم کی بنیاد موجود نہیں۔اس بات کے ثبوت کیلئے قرآنِ پاک سے ان آیات کے چند حوالے پیش کرتا ہوں جہاں 'امر' یا 'اُمور' کا لفظ آیا ہے۔فرمایا گیا ہے:

> "اگر مومنین کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں، تو ان کے مابین صلح کرادو۔پھر اگر ان میں سے ایک، دوسرے پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو، حتیٰ کہ وہ اللہ کے امر کی طرف لوٹ آئے..." (۹:۴۹)

> "...اور اُمور کا رجوع اللہ تعالیٰ ہی کی طرف ہے۔" (۲:۲۱۰؛ ۳:۱۰۹)
>
> "...اگر تم صبر کرو اور تقویٰ کرو تو یہ بڑے عزم کے اُمور ہیں۔" (۳:۱۸۶)
>
> "... اور اُمور کی عاقبت اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔" (۲۲:۴۱)

”... اور اللہ کا امر ہونا ہی تھا۔“(۳۳:۳۷)

”... کسی مومن یا مومنہ کا یہ کام نہیں کہ جب اللہ اور اسکا رسول کسی امر کا فیصلہ فرما دیں تو ان کے لئے ان کے کام کا کوئی اختیار ان کے پاس رہ جائے...“(۳۳:۳۶)

”اور وہ جنہوں نے اپنے رب کا حکم مانا اور نماز قائم کی، اور جن کے کام (امر) باہم مشورے سے ہوتے ہیں اور وہ ہمارے دئے ہوئے رزق سے خرچ کرتے ہیں۔“

(۴۲:۳۸)

’امر‘ یا ’اُمور‘ کے لفظ کی یہ چند مثالیں میں نے پیش کی ہیں۔ کیا انھیں اُمورِ دنیا اور اُمورِ دین میں تقسیم کیا جا سکتا ہے! ’اُمور‘ لفظ بہ لفظ ’امر‘ کا واحد ہے۔ قرآنِ پاک کے مطابق ’امور‘ معروف ہوتے ہیں یا منکر۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ماننے والوں کو ہمیشہ معروف کا امر دیا اور منکر سے منع کیا۔(۷:۱۵۷) منافق مرد اور منافق عورتیں برائی کا امر کرتے ہیں اور بھلائی سے روکتے ہیں۔(۹:۶۷)

قرآنِ پاک میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا پیدا فرمایا، مثلاً دن اور رات، موت اور حیات، ظلمات اور نور، مسلم اور مجرم، عالم اور جاہل، اندھا اور دیکھنے والا، نر اور مادہ وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں ’دنیا‘ کا ’دین‘ کے ساتھ جوڑا نہیں بنایا۔ قرآنِ پاک ہر مقام پر دنیا اور آخرت کو جوڑے کے طور پر بیان کرتا ہے۔ مثلاً”... اے ہمارے ربّ ہمیں دنیا میں بھلائی دے اور آخرت میں بھلائی دے، اور آگ کے عذاب سے بچا۔“(۲:۲۰۱) ’دین‘ کا لفظ قرآنِ پاک میں دین اسلام کیلئے آیا ہے یا دین کفر کیلئے، اور اسلام اور کفر ایک دوسرے کے مقابل آئے ہیں۔(۱۰۹:۶) یہ ممکن ہی نہیں کہ حضور نبیء کریم اپنے فرمان میں قرآنِ پاک کے ڈکشن سے بالکل برعکس الفاظ استعمال کریں۔

حضور کی اطاعت مطلق ہے۔ شاہد کی شان یہی ہے کہ ماننے والا خلوت اور جلوت کے ہر مقام پر آپ کا اتباع کرے اور اطاعت کرے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس کو حیثیات میں بانٹنے، معاملاتِ حیات کو اُمورِ دنیا اور اُمورِ دین میں تقسیم کرنے والے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مسلمان سائنسی علوم کی ترقی میں اس لئے پیچھے ہیں کہ وہ کھل کر تحقیق کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ ہر وقت یہی دھڑ کا لگا رہتا ہے کہ کہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اتباع اور اطاعت کے حکم کی خلاف ورزی نہ ہو جائے، جبکہ غیر مسلم بلا خوف، تحقیق کرتے ہیں۔ چنانچہ اس قبیل کے لوگ رسالت کو ذاتِ اقدس کی صرف ایک جہت قرار دیتے ہیں، اور اس جہت میں بھی حضور کے اتباع کو صرف اُمورِ دین تک محدود کر کے دعویٰ کرتے ہیں کہ سائنسی مطالعہ

وتحقیق کوئی امرِ دین نہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اتباع و اطاعت کے حکمِ الٰہی کا اطلاق ان اُمورِ پر نہیں ہوتا۔ بلکہ اس طرح کی قابلِ نفرت بات بھی کرتے ہیں کہ اُمورِ دنیا میں کوئی شخص اپنے دائرۂ علم میں (معاذ اللہ) حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بڑے علم والا ہو سکتا ہے۔

دائرۂ عبدیت میں ہر اعتبار سے جو شان حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو حاصل ہے، وہ ماضی میں کسی کو حاصل تھی، نہ حال پر ہے اور نہ مستقبل میں کبھی ہوگی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ادنیٰ پیروکاروں کی شان علم کے اعتبار سے اتنی بڑی ہے کہ اس کی مثال نہیں پیش کی جا سکتی۔ چونکہ 'تعمیر نخل' سے متعلق روایت کا تعلق ایک سائنسی حقیقت سے ہے اس لئے سائنس سے متعلق مثالیں زیادہ فائدہ مند ہوں گی۔

جب حضرت فضل شاہ قطبِ عالمؒ کے علم میں یہ بات آئی کہ ڈاکٹر دوا انجیکشن کی صورت میں براہِ راست خون کی نسوں میں داخل کر دیتے ہیں اور جدید سائنسی طریقِ علاج میں اس طریقے (intravenous) کو بہت فروغ حاصل ہو رہا ہے تو آپ بہت دیر تک افسوس کا اظہار کرتے رہے۔ فرمایا: 'بیٹا! اللہ نے تو کسی چیز کے براہِ راست خون میں شامل ہونے کا راستہ ہی نہیں رکھا۔ اس طریقے کو تو صرف اسی صورت میں استعمال کیا جانا چاہیئے جب مریض کی جان بچانے کیلئے اس کے علاوہ کوئی اور چارہ ءکار نہ ہو۔'

مذہبی لوگ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سنّت کی پیروی پر بہت زور دیتے ہیں، تزکیہ نفس اور تہذیب نفس کی بہت بات کرتے ہیں، اور سنّت کی پیروی انہیں صرف انھیں باتوں میں نظر آتی ہے جن سے بالعموم نہ فرد کو خود کوئی خاص فائدہ پہنچتا نظر آتا ہے نہ جماعت کو اور انکا سنّت ہونا قرآنِ پاک سے ثابت ہی نہیں ہوتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی پوری حیاتِ طیّبہ میں کبھی میدے کی بنی ہوئی اشیاء استعمال نہیں کیں۔ خلفاءِ راشدین کے زمانے میں میدے کی اشیاء استعمال کرنا قانوناً منع تھا۔ میں نے آج تک کسی عالمِ دین کو اس سنّت پاک کی پیروی کرتے ہوئے، اپنے پیروؤں کو اس سنّت پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کرتے ہوئے نہیں سنا اور نہ پڑھا۔ سب سے زیادہ خلاف ورزی اس سنّت پاک کی مکہ شریف اور مدینہ شریف میں ہوتی ہے۔ بے شمار بیماریاں محض اس ایک سنّت پاک پر عمل نہ ہونے سے پیدا ہوتی ہیں۔ جدید سائنسی طریقِ علاج کے ماہرین میں سے شائد ہی کوئی مریض کو میدے سے بنی ہوئی اشیاء کے استعمال سے منع کرتا ہو۔ جناب محمد اشرف فاضلی، جو علاج بالغذا کی بنیاد پر علاج کرتے ہیں سب سے پہلے ان اشیاء کے استعمال سے منع کرتے ہیں۔

جدید سائنسی طریقِ علاج کے ماہرین میں سے شائد ہی کوئی اپنے مریضوں کی غذا کا شیڈول بنوا کر مرض

کے سبب کو معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہو۔اب آیئے دیکھتے ہیں کہ حضرت فضل شاہ اور حضرت محمد اشرف فاضلی اس سلسلہ میں کیا ارشاد فرماتے ہیں۔فرمایا: ''تشخیص درست ہو،غذا اور دوا درست ہو، پرہیز ہو رہا ہو تو مریض کو افاقہ ہونا چاہئے۔مریض کے ذمّے ایک ہی کام ہوتا ہے اور وہ ہوتا ہے ان حدود کا احترام جو طبیب نے اس کیلئے مقرر کی ہیں، اور مریض کوتاہی بھی اسی میں کرسکتا ہے۔ہمیں اپنی تشخیص پر یا غذا اور دوا کے اعتبار سے اپنی تجویز پر کبھی شک نہیں ہوا۔'' مزید فرمایا: ''دوا شدتِ مرض کو کم کرنے کیلئے درکار ہوتی ہے۔غذا درست ہو تو طبیعت کو تقویت ملتی ہے، طبیعت کو تقویت ملے تو مرض مغلوب ہوتا ہے۔جسے غذا کا علم نہ ہو اس سے علاج کرانا کبھی خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔اس کی تجویز کردہ دوا اگر مفید بھی ہو تو بھی زندگی کے لوازمات میں داخل ہو جاتی ہے۔''۲۳

حدیث اور سیرتِ پاک کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ حضور نبیء کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو بکری کے شوربے کا ثرید بہت پسند تھا۔کروڑوں مسلمانوں میں سے گنتی کے چند لوگ ہی جانتے ہونگے کہ ثرید ہوتا کیا ہے۔اُمورِ دنیا میں بزعمِ خود 'اعلم' ہونے کے دعوے داروں کی اکثریت یہی سمجھتی ہے کہ جس طرح لوگوں کو کھانے پینے میں کچھ چیزیں مرغوب ہوتی ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو بھی ثرید مرغوب تھا۔جو رسالت کو ذاتِ اقدس کی حیاتِ طیبہ کا صرف ایک پہلو قرار دیتا ہو، اور صرف اُمورِ دین میں آپ کی اطاعت اور اتباع کو ضروری سمجھتا ہو، اور یہ کہتا ہو کہ اُمورِ دنیا سے متعلق اُمور میں لوگ (معاذ اللہ) حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بڑے علم والے ہوسکتے ہیں اس کے ذہن میں یہ سوچ آہی کیسے سکتی ہے کہ ثرید کی طرف حضور ﷺ کی رغبت غذا کے حوالے سے آپ کے بہت بڑے علم پر مبنی تھی۔ کتنے ماہرین علاج بالغذا (nutritionists اور dieticians) ہوں گے جو علاج بالغذا میں حضور کے اس علم سے استفادہ کرتے ہوں۔ ہر مقام پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نقشِ قدم کو بوسہ دینے والے ہی پر آپ کے علم کی شان روشن ہوسکتی ہے۔میں نے اپنے پیرو مرشد جناب حضرت محمد اشرف فاضلی صاحب کو صرف ثرید کے استعمال سے بظاہر لا علاج بیماریوں کا علاج کرتے اور لوگوں کو صحتیاب ہوتے دیکھا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو پتلے شوربے والا سالن پسند تھا، آپ بھنا ہوا گوشت پسند نہیں کرتے تھے۔تعمیرِ نخل والی روایت کو ماننے والوں پر، علم کو سیکولر علم اور مذہبی علم میں تقسیم کر کے حضور کے علم کو صرف مذہبی اُمور کے علم تک محدود کرنے والوں پر، پتلے شوربے والا سالن پسند کرنے میں، کھجور، جَو، ستو، شہد، ثرید کے استعمال میں حضور کے علم کی شان کیسے روشن ہوسکتی ہے۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے علم کو اُمورِ دنیا اور

اُمورِدین میں تقسیم کرنے والوں کو اس کے طبی فوائد اور روحانی فوائد کا علم ہو ہی کیا سکتا ہے۔حضرت فضل شاہ اورحضرت محمد اشرف فاضلی کی قبیل کے لوگ ہی یہ فرما سکتے ہیں کہ ''جس کی پسند کو پسند کرلیا جائے اس کے قریب ہونے کا شرف ہو جاتا ہے۔''حضور حضرت فضل شاہ قطبِ عالمؒ ظاہری اعتبار سے تعلیمیافتہ نہیں تھے،لیکن مختلف علوم کے ماہرین میں سے جس جس کو حضرت فضل شاہ قطبِ عالم رحمت اللہ علیہ کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہوا،تمام عمر آپ کے علم کی عظمت کو سلام کرتا رہا۔

حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ پاک تشریف لائے ،تو مہاجرینِ مکہ اور انصارِ مدینہ کے درمیان آپ نے مواخات کا رشتہ قائم کر دیا۔اس سے نہ صرف مہاجرین و انصار کے درمیان گہری یگانگت پیدا ہوگئی بلکہ مہاجرین کیلئے بعد میں میثاقِ مدینہ کی بنیاد پر وجود میں آنے والے عُمرانی نظام میں ضم ہونا ممکن ہوگیا۔عرب کے قبائلی نظام میں مختلف معاہدے کرنا کوئی نئی بات نہ تھی۔وہ پہلے بھی ایک دوسرے کے ساتھ معاہدے کرتے رہتے تھے، ''تاہم مواخات اپنی نوعیت اور اثر آفرینی کے اعتبار سے اپنی مثال آپ تھی۔مواخات کی بدولت مدینہ میں ایک ایسا معاشرہ وجود میں آیا جس کی اساس اسلام تھا، نہ کہ قبائلی تخصص و امتیاز!''پوچھا جاسکتا ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف سے مہاجرین و انصار کے درمیان مواخات کا رشتہ قائم کرنا اُمورِدین میں سے تھا یا اُمورِدنیا میں سے!مواخات کی بنیاد پر وجود میں آنے والی اس اسلامی کمیونٹی کے علاوہ مدینہ پاک میں یہود اور مشرک بھی موجود تھے۔ایک پر امن معاشرے کے قیام کیلئے ضروری تھا کہ ان غیر مسلم قبائل کے ساتھ بھی تعلقات کی نوعیت متعین کرلی جائے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہود اور دیگر اہلِ مدینہ کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جو میثاقِ مدینہ کے نام سے مشہور ہے۔''اس معاہدے کی کل 47 دفعات ہیں... پہلی تئیس (۲۳) دفعات مسلمانوں کے بارے میں ہیں اور باقی یہود اور دیگر اہلِ مدینہ کے بارے میں۔''اس معاہدے سے مدینہ پاک میں مدتوں سے قیام پذیر گروہوں اور متفرق قبیلوں کے درمیان امتِ مسلمہ ایک منفرد سماجی اکائی کی حیثیت سے ابھری۔امتِ مسلمہ کے دیگر غیر مسلم قبائل کے ساتھ ربط وضبط کی شرائط بھی متعین کردی گئیں،اس طرح ان بکھرے ہوئے قبائل کے درمیان ریاستی تنظیم کی صورت وجود میں آئی اور مدینے کی سماجی، سیاسی اور معاشی زندگی میں ایک ربط و آہنگ پیدا ہوگیا۔[۲۴] کیا یہ بتایا جا سکتا ہے کہ اس معاہدے کا تعلق سیکولر نالج سے ہے یا ریلیجس نالج سے!حضرت نوح علیہ السلام نے جو کشتی تیار کی،اس کا علم کس سے سیکھا تھا!حضرت یوسف علیہ السلام خوابوں کی تعبیر کس علم سے بتاتے تھے؛مصر میں خوشحالی کے سات سالوں میں غلّے کو سنبھالنے اور اور پھر قحط کے سات سالوں میں تقسیم کرنے کا علم سیکولر نالج تھا یا ریلیجس نالج !یہ اُمورِدنیا

سے تعلق رکھتا تھا یا اُمورِ دین سے! حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کی تربیت کہاں سے حاصل کی تھی! کہا جاتا ہے کہ جنگِ بدر کے موقعہ پر ابتداً حضور نے پڑاؤ بدر کے چشمے کے قریب ڈال دیا۔ حبابؓ بن منذر نے آگے بڑھ کر عرض کیا: یارسول اللہ! کیا یہ مقام ایسا ہے جہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ نے اتارا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نہیں یہ میری ذاتی رائے ہے۔ حبابؓ نے گزارش کی: یہ مقام اچھا نہیں۔ آگے تشریف لے چلئے۔ ہم اس چشمے پر اتریں گے جو قریش کے قریب تر ہے۔ اس کے پیچھے جتنے چشمے ہیں ان کو ہم ناکارہ بنادیں گے اور اپنے چشمے کے پاس حوض بنا کر اس میں پانی ذخیرہ کرلیں گے۔ حباب بن منذر کی رائے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پسند فرمایا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آگے بڑھے اور قریش کے قریب تر چشمے پر پڑاؤ ڈال دیا۔ ۲۵ علوم دو قسم کے ہوتے ہیں: علمِ کسب (man-made knowledge, acquired knowledge) اور علمِ الٰہی (God-given knowledge)۔ انبیا و رسل کا علم، علمِ الٰہی ہوتا ہے، اور یہ علم تمام اُمور پر محیط ہوتا ہے۔ یہ حضراتِ گرامی معلم ہوتے ہیں۔ یہ اگر مشورہ کرتے ہیں تو مشورہ کرنے اور مشورہ دینے کا علم سکھانے کیلئے۔ بہتر جاننے والے کی خدمت میں مشورہ پیش کرنے کا منشا اس کے علم میں اضافہ کرنا نہیں ہوتا، اپنے علم کی تصدیق یا تصحیح ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اگر بدر کے چشمہ پر پڑاؤ ڈال دیا تھا تو یقیناً یہ علمِ الٰہی کی بنیاد پر تھا۔ مبتدی یہ سمجھ لیتا ہے کہ بعض امور میں اسے جو علم ہے وہ منتہی کو نہیں۔ منتہی وہ بھی جانتا ہوتا ہے جو مبتدی جانتا ہے، اور وہ بھی جانتا ہے جو مبتدی نہیں جانتا۔ لیکن اپنے ساتھیوں کو ساتھ رکھنے کیلئے، قریب ہونے میں مدد دینے کیلئے، جس حد تک ممکن ہو ان کی بات مان بھی لیتا ہے تاکہ ان میں اعتماد پیدا ہو۔ اگر حباب بن منذر نے کوئی رائے نہ دی ہوتی یا حضور نے قریش کے قریب تر چشمے پر پڑاؤ ڈالنا پسند نہ کیا ہوتا تو یہی جگہ مسلمانوں کیلئے ہر اعتبار سے موزوں ہو جاتی اور اس جگہ کے انتخاب میں جو حکمت تھی وہ لوگوں کو نظر آجاتی۔ اللہ کا وعدہ ہے: ''اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ بے شک میں غالب آؤں گا اور میرے رسول غالب آئیں گے۔ بے شک اللہ قوت والا، عزّت والا ہے۔'' (۲۱:۵۸) اللہ کے رسول کی فتح جنگِ بدر میں حباب بن منذر اور جنگِ خندق میں حضرت سلمان فارسی کے مشورہ کی وجہ سے نہیں تھی۔ حضور جہاں بھی پڑاؤ ڈالتے یا جنگ کا جو طریقہ بھی اختیار کرتے، علمِ الٰہی سے ہوتا اور آپ یقیناً غالب رہتے۔ مشورہ دینے والے اپنے ماضی کا علم حضور کی خدمت میں اس احساس کے ساتھ پیش کرتے تھے کہ اللہ اور اسکا رسول بہتر جانتے ہیں۔ اگر حضور اس علم کی تصدیق فرمادیں گے یا تصحیح فرمادیں گے تو یہ علم سنبھال رکھنے کے لائق ہو جائے گا، ورنہ اس علم کو چھوڑ دیا جائیگا۔ پاک لوگ ہر آواز کو آوازۂ حق سمجھتے ہیں اور علمِ الٰہی کی بنیاد پر اپنا حق ادا کرتے ہیں۔ جنگِ احد کے

حوالے سے ایک واقعہ سے اس بات کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہر کے اندر رہ کر جنگ کرنا پسند فرما رہے تھے، اور یہ کہا جاتا ہے کہ حضور کو اس سلسلے میں خواب بھی آ چکا تھا کہ شہر میں رہ کر جنگ لڑنا مناسب ہے، اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نبی علیہ السلام کا خواب بھی وحی کے مترادف ہوتا ہے، لیکن نوجوان صحابۂ کرام کی کثرت تھی، جنہیں جنگِ بدر میں جنگ لڑنے کا موقع نہیں ملا تھا، اب وہ چاہتے تھے کہ انھیں کھلے میدان میں بہادری کے جوہر دکھانے کا موقع مل سکے، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نوجوان صحابۂ کرام کی اکثریت کے اصرار پر شہر سے باہر جا کر جنگ لڑنے کا فیصلہ فرمایا۔ اس سے نتیجہ یہ نکالا جاتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اکثریت کی رائے کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ جو نتیجہ اس روایت سے نکالا جا رہا ہے وہ درست نہیں۔ نبی کی شان یہ ہے کہ وہ مطاعِ مطلق ہوتا ہے۔ اس کے اتباع سے اللہ کے محبوب بندوں کی صف میں شمار ہونے کا شرف ہوتا ہے اور اس کی اطاعت سے انعام یافتہ بندوں میں شمار ہو جاتا ہے۔ ماننے والے قلیل ہوں یا کثیر، وہ اپنا حق ادا کرتا ہے۔ اس کا فیصلہ ہمیشہ علمِ الٰہی کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ آپ یہ سمجھتے کہ جنگ شہر کے اندر ہی رہ کر لڑنے کا حکم ہے تو آپ یقیناً یہ فرما دیتے، کہ جڑ جائے جس نے جڑنا ہے اور ٹوٹ جائے جس نے ٹوٹنا ہے، ہم وہی کریں گے جس کا ہمیں حکم ہے۔ کیا صلح حدیبیہ کے موقع پر آپ نے کسی اکثریت کی رائے کو اہمیت دی؟ حضرت فضل شاہ اور جناب محمد اشرف فاضلی صاحب کا ارشاد ہے کہ بہتر جاننے والے کی مان لی جائے تو بھلا ہو جاتا ہے، منوائی جائے تو مشقت گلے پڑ جاتی ہے۔

اُمورِ دنیا اور اُمورِ دین میں تفریق کرنے والوں نے کئی ایسی روایات ڈھونڈ نکالی ہیں جن کی بنیاد پر وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقام عام لوگوں سے بس اتنا ہی بڑا تھا کہ نبی اور رسول ہونے کی حیثیت سے اُمورِ دین آپ ہی سے سیکھے جا سکتے تھے ورنہ جہاں تک اُمورِ دنیا کا تعلق ہے کئی مقامات پر عام صحابی کی بات (معاذ اللہ) کہیں بہتر تھی، یا بعض مواقع پر حضور کے کسی فیصلہ پر (معاذ اللہ) آیاتِ عتاب نازل ہوئیں۔ شاہدین، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس کو مقصودِ کائنات مانتے ہیں، عبدیت کا اکمل نمونہ مانتے ہیں۔ اُمورِ دنیا اور اُمورِ دین کی تفریق کو خلافِ حق سمجھتے ہیں۔ کسی کا علم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑا بھی ہو سکتا ہے، نا قابلِ تصور اور سخت بے ادبی کی بات سمجھتے ہیں۔ ان روایات کو قرآنِ پاک میں بیان کی گئی حضور کی شان کے مطابق نہ ہونے کی بناء پر خلافِ واقعہ سمجھتے ہیں یا اس کی تعبیر کو غلط سمجھتے ہیں۔ ایسی بہت سی روایات ہیں، فی الحال ایک روایت مزید بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں ہے۔

سورہ عَبَسَ قرآن پاک کی اسّی (۸۰) نمبر کی سورت ہے اور تیسویں پارے میں واقع ہے۔ اس کی

ابتدائی چند آیات کا ترجمہ اس طرح ہے:

''اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا؛ اس پر کہ وہ نابینا اس کے پاس آیا۔ اور تمھیں کیا معلوم کہ وہ تزکیہ پانے والا ہوتا؛ یا نصیحت سنے تو نصیحت اسے نفع دے۔ وہ جو بے پرواہ بنتا ہے؛ تم اس کی طرف رخ کرتے ہو۔ حالانکہ وہ اگر پاک نہ ہو، تو تم پر کوئی ذمہ داری نہیں۔ اور جو تمھارے پاس ذوق سے آتا ہے؛ اور وہ اللہ سے ڈرتا بھی ہے؛ تم اس سے بے رخی برتتے ہو۔'' (۸۰ : ۱۔۱۰)

حضرت عبداللہ ابن مکتوم جو نابینا صحابی بیان کئے جاتے ہیں، کے حوالے سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے متعلق ایک روایت گھڑلی گئی ہے اور ان آیات میں موجود سرزنش کا انتساب (معاذ اللہ) حضور نبیءِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے کر دیا گیا ہے۔ تفسیرِ فاضلی میں ان آیات کی وضاحت اس طرح فرمائی گئی ہے:

> ''تبلیغ حق کرنے والے ایک صاحب کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا۔ یہ صاحب تبلیغ کر رہے تھے۔ سامعین کو خیر کی طرف لانے کا کام بڑا نازک ہوتا ہے۔ اگر ان میں طلبِ ہدایت کی کمی ہو تو یہ کام بہت ہی نازک ہوتا ہے۔ ان صاحب کو بھی ایسی ہی صورتحال سے واسطہ پڑا۔ اسی اثنا میں ایک نابینا صاحب اس مجلس میں حاضر ہوئے اور حاضرین مجلس کی کیفیت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی بات شروع کر دی۔ اس پر تبلیغ کرنے والے صاحب کو نابینا صاحب کی مداخلت ناگوار ہوئی تو اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا۔ یہ بات قطعاً اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے تعلق نہیں رکھتی کہ اللہ نے اپنے رسول کے بارے میں جو کچھ بھی ارشاد فرمایا ہے، یہ بات اس سے میل نہیں کھاتی''۔

(تفسیر فاضلی منزل ہفتم، فاضلی فاؤنڈیشن ۱۹۹۸، ص ۳۶۹)

تدبّر فرمائیے اللہ تعالٰی نے نبی پاک ﷺ کے بارے میں کیا فرمایا ہے:

(۱) آپ کا خلق عظیم ہے۔ (۶۸:۰۴)

(۲) کہ ہم نے تم میں، تمھیں میں سے رسول بھیجا، جو تم پر ہماری آیات تلاوت فرماتا ہے، تمھیں پاک کرتا ہے، تمہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے، اور تمھیں وہ علم دیتا ہے جو علم تمھیں نہیں تھا۔ (۲:۱۵۱)

اب اگر خلقِ عظیم کے حوالے سے اللہ کا رسول بھی معیارِ مطلق نہ ہو، تو تزکیہ عطا ہونے کے باوجود، کتاب و

حکمت کا علم عطا ہونے کے باوجود، اور وہ علم عطا ہونے کے باوجود جو بڑی شان رکھتا ہے، بندے کی تکمیل تو نہیں ہوگی۔

(۳) اللہ کے رسول کی اطاعت ہو تو اللہ کی اطاعت ہوتی ہے۔ رسول کی اطاعت نہ کرنے والے اللہ کو پسند نہیں ہوتے۔ (۳۲:۳) اب اگر اللہ کے رسول کے، اللہ کی اطاعت کا معیارِ مطلق ہونے میں ہی شک ہو جائے تو ایمان کا مقام ہی کہاں رہے گا۔

(۴) ارشاد ہے: اگر تم میں تنازع ہو جائے تو اللہ اور اسکے رسول کی طرف رجوع کرو۔ (۵۹:۴) اللہ کے رسول کے ارشاد کو سند مانا جائے گا تو تنازعہ ختم ہوگا۔

(۵) پھر ارشاد ہے: اگر تم رسول کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پاؤ گے، اور رسول کے ذمّے تو پہنچا دینا ہی ہے۔ (۵۴:۲۴)

(۶) فرمایا گیا ہے: بے شک اللہ کے رسول کی حیاتِ طیبہ تمھارے لئے اسوۂ حسنہ ہے۔ (۲۱:۳۳) اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہمارے لئے سند کا درجہ رکھتا ہے۔ پس تیوری چڑھانا اور منہ پھیرنا، آپ کی شان کے لائق ہی نہیں۔

(۷) حبّ الناصحین شرطِ ایمان ہے۔ (۷۹:۷) حضور سے محبت ہوگی تو ایمان کی حبّ نصیب ہو گی۔ کسی منفی صفت کو آپ سے منسوب کرنا محبت کی نفی اور قطعاً بے ادبی ہے۔ اندازہ کیجئے ان لوگوں کی بے سمجھی کا جو قرآنِ پاک میں جہاں بھی صیغہ واحد حاضر میں یعنی 'تُو' کہہ کر خطاب کیا گیا ہے، یہ دیکھے بغیر کہ کیا یہ بات حضور کی شان سے تعلق رکھ سکتی ہے کہ نہیں، اسے حضور پاک سے منسوب کر دیتے ہیں جیسے سورہ البقرہ میں فرمایا گیا ہے: ''حق تمھارے رب کی طرف سے ہے، تُو شک لانے والوں میں سے نہ ہو۔'' (۱۴۷:۲) یا سورہ الضحیٰ میں فرمایا گیا ہے: ''اور تجھے گمراہ پایا تو ہدایت نہ دی۔ (۷:۹۳)

اب قرآنِ پاک کی درج ذیل آیات ملاحظہ فرمایئے:

ارشادِ باری ہے: وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا کہ اسے سب دینوں پر غالب کرے۔ اور اللہ کی گواہی کافی ہے۔ (۳۳:۹؛ ۹:۶۱) یہ گمان کہ کبھی آپ کی بات ہدایت اور دین حق کے علاوہ بھی کچھ ہوتی تھی، قطعاً خلافِ حق ہے۔ اسی طرح فرمایا گیا: ہم نے آپ کو شاہد بنا کے بھیجا، بشارت دینے والے اور انذار کرنے والے۔ (۴۵:۳۳؛ ۸:۴۸) حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اے بنی اسرائیل میں تمھاری طرف اللہ کا رسول ہوں ۔۔۔ اور اپنے بعد آنے والے رسول کی بشارت دیتا ہوں جس کا اسم شریف

'احمد' ہے۔(۶:۶۱)فرمایا گیا:محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔اور جولوگ آپ کی معیت میں ہیں کافروں پر شدید اور آپس میں رحم کرنے والے ہیں۔تم ان کو دیکھو گے،رکوع کرتے ہوئے، سجدہ کرتے ہوئے۔اللہ کا فضل اور اسکی رضا چاہتے ہیں۔انکی نشانی ان کے چہروں پر سجود کے اثر سے ہے۔یہ توصیف ان کی تورات میں ہے۔اور انجیل میں ان کی مثل یوں ہے.....۔(۲۹:۴۸)فرمانِ الٰہی ہے: اور ہم نے آپ کو رحمت اللعالمین بنا کر بھیجا ہے۔(۱۰۷:۲۱) اللہ نے نبیوں سے میثاق لیا کہ جو کتاب وحکمت تمھیں عطا ہو اسکی تقسیم کرو، پھر رسول تمھارے پاس تشریف لائے کہ جو تمھارے پاس ہے اس کی تصدیق فرمائے،تو تم ضرور آپ پر ایمان لانا اور آپ کی نصرت کرنا...۔(۸۱:۳)جس کی یہ شان بیان کی گئی ہے، کیا صیغہ واحد حاضر میں بیان کی بنا پر آیت نمبر(۱۴۷:۲)اور(۹۳:۷)میں خطاب کو اس ذاتِ اقدس سے منسوب کیا جا سکتا ہے!حضرت عیسیٰ علیہ السلام ابھی نوزائیدہ تھے کہ آپ نے کلام کیا اور فرمایا: بے شک میں اللہ کا بندہ ہوں۔اس نے مجھے کتاب عطا فرمائی ہے۔اور مجھے نبی ٹھہرایا ہے۔اور اس نے مجھے برکت والا کیا ہے، جہاں بھی ہوں، اور صلوٰۃ و زکوٰۃ کی وصیت فرمائی ہے جب تک حیات ہوں۔اور اپنی والدہ سے حسنِ سلوک کرنے والا۔اور اس نے مجھے جبّار اور شقی نہیں ٹھہرایا۔(۱۹: ۳۰۔۳۲) حضرت زکریا علیہ السلام نے پاک اولاد کیلئے دعا کی۔فرمایا گیا:اللہ تعالیٰ آپ کو یحییٰ علیہ السلام کی بشارت دیتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کے ایک کلمہ کے مصدق ہونگے، سردار،عورتوں سے بچنے والے،اور نبی ہونگے صالحین سے۔(۳۹:۳)ابھی حضرت یحییٰ علیہ السلام پیدا نہیں ہوئے، انکی شان اور مقام پہلے ہی بتا دیا گیا۔اسی طرح فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام کی پیدائش کی بشارت دی اور ساتھ ہی پوتے حضرت یعقوب علیہ السلام کی پیدائش کی بشارت دی اور اللہ نے دونوں کو صالح ٹھہرایا۔(۷۲:۲۱؛ ۷۱:۱۱)حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: میں نے آپ کو اپنے لئے بنایا اے موسیٰ۔(۴۱:۲۰)جسے رحمت اللعالمین بنا کر بھیجا گیا ہے، جسے ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا گیا، جس کے بارے میں تمام انبیاء سے میثاق لیا گیا، جس کے شرف و کرم کا تمام انبیاء و رسل اعلان کرتے چلے آئے، جس کا اسمِ گرامی آپ کی تشریف آوری سے صدیوں پہلے انجیل میں، اور آپ اور آپ کے ساتھیوں کی توصیف توریت اور انجیل میں بیان کر دی گئی، جس کے ہاتھ کو اللہ نے اپنا ہاتھ قرار دیا، جس کے قدم مبارک سے قدم آگے بڑھانے کو اللہ نے اپنے سے تقدم فرمایا، جس کے قلب مبارک پر قرآنِ پاک کا نزول فرمایا گیا، جس کی زبانِ اقدس کے بارے میں فرمایا گیا کہ" آپ تو خواہشِ نفس سے بات ہی نہیں کرتے، وہی کہتے ہیں جو آپ پر وحی کی جاتی ہے۔"کتنی بے سمجھی کی بات ہے کہ"حق تمھارے رب کی طرف سے ہے،تُو شک لانے والوں

میں سے نہ ہو۔" (۲:۱۴۷) یا "اور تجھے گمراہ پایا تو ہدایت نہ دی ۔ (۹۳:۷) اور ایسی دیگر آیات کا انتساب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس سے کیا جائے ۔

قرآنِ پاک کا اسلوب تقریری ہے، تحریری نہیں ۔ایک آیت میں خطاب مومنین سے ہو تو دوسری آیت میں خطاب کافرین سے ہو سکتا ہے، اہلِ کتاب سے ہو سکتا ہے ۔کبھی خطاب کرنے والا صیغہ واحد حاضر کے ذریعے ایک ایک فرد سے براہِ راست مخاطب ہوتا ہے ۔قرآنِ پاک کے مفہوم کو صحیح طور پر سمجھنے کیلئے اور بھی کئی باتوں کا دھیان رکھنا ضروری ہے ۔ایک ہی مضمون میں تمام پہلوؤں کا زیرِ بحث لایا جانا ممکن نہیں ۔اہم ترین بات یہ ہے کوئی بھی مقام ایسا نہیں جہاں اللہ تعالیٰ نے حق تک پہنچنے میں رہنمائی نہ کی ہو ۔فرمانِ الٰہی ہے: نرفع درجت من نشاء ط فوق کل ذی علم علیم۔ (۷۶:۱۲) ہم درجات بلند کرتے ہیں جس کے چاھیں۔اور ہر علم والے سے اوپر ایک علم والا ھے۔ بہتر جاننے والے ہر حال پر ہوتے ہیں ۔جسے اطیمنان کی طلب ہو وہ کسی بہتر جاننے والے کو تلاش کر لے ۔بدنصیبی یہ ہے کہ جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم ہی کو معیار نہیں مانتا وہ کسی دوسرے کو بڑے علم والا کیسے مان لے گا ۔

(۸) حکم ہے: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو عطا فرمائیں، وہ لے لو، جس سے منع کر دیں اس سے منع ہو جاؤ، اور اللہ سے ڈرو ۔بے شک اللہ کا عقاب شدید ہے ۔ (۵۹:۷) اللہ کے رسول کے فرمان کو فرمانِ الٰہی مانا جائے گا تبھی ماننے کا حق ادا ہو سکتا ہے ۔

(۹) اللہ کے نبی کا قوم سے منہ پھیرنا بہت بڑی بات ہوتی ہے ۔حضرت صالح علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام کی مثال دیکھئے ۔اللہ کے نبی منہ پھیر لیں تو عذابِ الٰہی سے بچ جانا ممکن نہیں رہتا کہ نبی، اللہ کے امر کے مطابق ہی کرتے رہے ہیں ۔۲۶

(10) اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تقدم سے منع فرمایا گیا ہے ۔ (۴۹:۱) اللہ کا قدم تعین سے پاک ہے ۔اللہ کے رسول سے تقدم ہی دراصل اللہ سے تقدم ہے اور اس سے منع فرمایا گیا ہے ۔حضور پاک کی ذاتِ اقدس کی شان میں قرآنِ پاک کی مذکورہ اسناد کے ہوتے ہوئے جو لوگ نبی پاک کی حیثیتوں کا تعین کرتے ہیں اور رسول ہونے کو حضور کی ذاتِ اقدس کی محض ایک حیثیت قرار دیتے ہیں، اور اس حیثیت میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم کو اُمورِ دنیا اور اُمورِ دین میں تقسیم کر کے حضور کے ساتھ یہ بات منسوب کرتے ہیں کہ آپ نے خود فرمایا ہے کہ 'تم اپنے اُمورِ دنیا میں مجھ سے بڑے علم والے ہو سکتے ہو' (انتم اعلم بأمورِ دنیا کم ۔) کیا وہ ایک بے سند روایت کو سند پر ترجیح دے کر اللہ اور اس کے رسول سے تقدم کا ارتکاب

نہیں کرر ہے۔عملاً اس تقدّم کا اظہار کس طرح ہوتا ہے، اسکے لئے ایک مثال پیش کرر ہا ہوں۔

زبان و ادب اور گریمر سے متعلق علوم اوپر بیان کی گئی تعریف کے مطابق 'اُمورِ دنیا' کے ذیل میں آئیں گے۔ایک صاحب جنھیں عربی زبان، صرف ونحو، اور دورِ جاہلیت کے عربی ادب میں بہت ماہر قرار دیا جاتا ہے، کی تفسیرِ قرآن سے سورہ البقرہ کی پہلی آیت 'الم' کی تفسیر کا خلاصہ پیش کرتا ہوں:

جو لوگ عربی رسم الخط کی تاریخ سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ عربی زبان کے حروف عبرانی سے لیے گئے ہیں اور عبرانی زبان کے حروف ان حروف سے ماخذ ہیں جو عرب قدیم میں رائج تھے۔عربِ قدیم کے یہ حروف محض آواز ہی نہیں بتاتے تھے بلکہ معانی اور اشیاء پر بھی دلیل ہوتے تھے اور عموماً انہی اشیاء کی صورت اور ہیئت پر لکھے بھی جاتے تھے۔ان حروف کے معنی کا علم اب مٹ چکا ہے تاہم بعض حروف کے معنی اب بھی معلوم ہیں اور ان کے لکھنے کے ڈھنگ میں ان کی قدیم شکل کی جھلک پائی جاتی ہے۔مثلاً 'الف' گائے کے معنی بتاتا تھا اور گائے کے سر کی صورت ہی پر لکھا جاتا تھا۔'الف' کے ایک معنی اللہ واحد کے بھی ہوتے تھے۔'ب' کو بیت یعنی بدوؤں کے خیمے، 'جیم' کو جمل یعنی اونٹ، اور 'نون' کو مچھلی، 'م' کو پانی کی لہر اور 'ط' کو سانپ کی شکلوں سے ظاہر کیا جاتا تھا اور ان کے معنی بھی یہی ہوتے تھے۔عبرانی زبان کے حروفِ تہجی میں اس کا تصویری عنصر بہت کم ہوگیا۔عربی زبان کے حروفِ تہجی جب عبرانی سے لئے گئے تو تجریدی عنصر اور بڑھ گیا۔اب 'الف' بالکل سیدھا ہوگیا۔'بیت' کا اوپر والا حصہ غائب ہوگیا اور کھونٹے کا نشان 'ب' کے نقطے کی صورت اختیار کرگیا۔باقی الفاظ کے اظہار میں بھی اسی طرح تبدیلیاں آگئیں۔اس سورہ میں بنی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا حکم دئے جانے کا ایک مشہور واقعہ ہے جس کی مناسبت سے اس سورہ کا نام بھی البقرہ ہے۔حروفِ مقطعات 'الـــم' میں پہلا حرف 'الف' گائے کے اس واقعہ کیطرف علامتی اشارہ ہے۔حروف 'لام' اور 'میم' کے بارے میں بھی اسی طرح تحقیق کی جاسکتی ہے! 'الـــــــم' کی تقریباً سوا تین صفحات پر مشتمل مذکورہ بالا تحقیق پیش کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔"میرے نزدیک اس کی حیثیت ابھی تک ایک نظریہ سے زیادہ نہیں ہے۔جب تک تمام حروف کے معنی کی تحقیق ہوکر ہر پہلو سے ان ناموں اور ان سے موسوم سورتوں کی مناسبت واضح نہ ہوجائے اس وقت تک اس پر ایک نظریہ سے زیادہ اعتماد کرلینا صحیح نہیں ہوگا۔" (امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن جلد اول، فاران فاونڈیشن لاہور پاکستان، ۱۹۹۹، ص ۸۲۔۸۵) سوال یہ ہے کہ اس پر جتنی بھی تحقیق کرلی جائے کیا یہ تحقیق کبھی بھی پایۂ یقین کو پہنچ سکے گی، کیا اس قیاس آرائی کے نتیجے میں کسی کو قرآنِ پاک سے ہدایت نصیب ہوسکتی ہے، کیا قیامت کے دن ان الفاظ کے معنی کے بارے میں کسی کو جوابدہ ٹھہرایا جائے گا!

عربی رسم الخط کی تاریخ کے بارے میں اپنے استادِ محترم کی تحقیق پیش کرنے سے پہلے مذکورہ مفسرِ قرآن حروفِ مقطعات پر سورتوں کے نام ہونے کے حوالے سے نظر ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں: ''یہ جس سورت میں بھی آئے ہیں بالکل شروع میں اس طرح آئے ہیں جس طرح کتابوں، فصلوں اور ابواب کے شروع میں ان کے نام آیا کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کی یہ ان کے نام ہیں۔'' یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ''جو سورتیں ان ناموں سے موسوم ہیں اگر چہ ان میں سے سب اپنے انہی ناموں سے مشہور نہیں ہوئیں، بلکہ بعض دوسرے ناموں سے مشہور ہوئیں۔'' اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ حروفِ مقطعات کو سورتوں کے محض نام قرار دینا، قیاس آرائی ہے، بے سند بات ہے۔ فاضل مفسّر قرآن خود بھی اس کا اعتراف کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ''کم از کم فہمِ قرآن کے نقطۂ نظر سے ان ناموں کے معنی کی تحقیق کی تو کوئی خاص اہمیت ہے نہیں۔'' (ایضاً ص ۸۵) اگر فہم قرآن کے حوالے سے اس تحقیق کی کوئی اہمیت نہیں، اور قیاس آرائی سے زیادہ اس کی حیثیت نہیں، ہدایت اور نجات کا اس پر انحصار نہیں، عملی زندگی میں اس سے کوئی فائدہ نہیں تو امورِ دنیا کے اس علم میں 'اعلم' ہونا کس کام کا ہے۔ حضور پاک سے زیادہ کوئی ان الفاظ کی تفسیر بیان کرنے کا حقدار نہیں ہوسکتا تھا۔ جس مقام پر حضور پاک نے خاموش رہنا پسند فرمایا، اس مقام پر کلام کرنا کیا اللہ اور اس کے رسول سے تقدم نہیں! کیا یہ اللہ اور اسکے رسول سے تقدم نہ کرنے کی نصِ صریح کی خلاف ورزی نہیں! حقیقت یہ ہے کہ حروفِ مقطعات کسی سورت میں ایک پوری آیت کے طور پر آئے ہیں جیسے سورہ البقرہ میں، اور کسی سورت میں آیت کے حصے کے طور پر آئے ہیں۔ اس طرح یہ متن قرآن پاک میں شامل ہیں، اور اسی حیثیت میں ان پر تدبر کیا جانا چاہئے۔

آیئے دیکھتے ہیں تفسیرِ فاضلی اس آیت کی تفسیر کس طرح بیان کرتی ہے:

> ارشاد ہے: ''صاحبو! ان کے معنوں کا تعین کرنا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تقدم ہے، اور خلافِ حق ہے۔ **حاصل**: بولنے کے مقام پر بولنا، اور خاموشی کے مقام پر خاموش رہنا ضروری ہے۔'' (تفسیر فاضلی منزل اول، ص۴)

(۱۱) ارشاد ہے: اے ایمان والو! تم اپنی آوازوں کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز سے بلند نہ کیا کرو، اور نہ آپ کو اس طرح بلند آواز سے پکارا کرو جیسے ایک دوسرے کو پکارتے ہو، ایسا نہ ہو کہ تمھارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تمھیں شعور بھی نہ ہو۔ (۲:۴۹) آوازِ حق کے مقابل اپنی آواز کو پست رکھنا ادب ہے، اور آوازِ حق کے مقابل اپنی آواز کو بلند کرنا تقدم ہے۔ جو لوگ سائنسی اور فلسفیانہ علوم کو سیکولر نالج قرار دیکر یہ کہتے ہیں کہ ان علوم میں تحقیق کرنے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اتباع کے ہم مکلف نہیں، کیا وہ آوازِ حق کے مقابل اپنی

آوازوں کو بلند نہیں کر رہے!

(۱۲) ارشادِ ربانی ہے: ''اور تمھیں معلوم رہے کہ اللہ کے رسول تم میں ہیں۔ اگر یہ کثیر اُمور میں تمھاری مان لیا کریں، تو تم مشقت میں پڑ جاؤ گے۔'' (۴۹:۷) اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ نے جس علم سے نوازا ہے، وہ علم سب سے بڑی شان رکھتا ہے۔ اس علم کی قدر کرنی چاہئے اور اس سے استفادہ کرنا چاہئے اور کبھی اپنے گمان کو یہ درجہ نہیں دینا چاہیے کہ حق کے مقابل اسے قابلِ ذکر سمجھا جائے۔ حضورِ اکرم اگر اکثر اُمور میں لوگوں کی مان لیا کرتے تو لوگ یقیناً مشقت میں پڑتے۔''[۴۷] اللہ کے حکم کے مقابل حضور کسی کی بات مان لیں، یہ ممکن ہی نہیں۔ جہاں اللہ کا حکم نہ بھی ہو، حضور کا فیصلہ علمِ الٰہی سے ہوتا ہے۔ جو لوگ حضور کی مان لیتے ہیں حضور کے علم کو سلام کرتے ہیں، ان کا بھلا ہو جاتا ہے، جو لوگ حضور کی نہیں مانتے حضور انکی مان لیتے ہیں تا کہ ساتھ قائم رہے، لیکن مشقت ان کے گلے پڑ جاتی ہے۔ جنگِ احد کے موقعہ پر جب لوگوں نے حضور کی بات نہیں مانی، تو کیا مشقت ان کے گلے نہیں پڑ گئی۔

بیعتِ رضوان کے موقعہ پر اگر چہ یہ نوید سنائی جا چکی تھی کہ اللہ تعالیٰ راضی ہو گیا ان سب سے جنہوں نے درخت کے نیچے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دستِ اقدس پر بیعت کی، (الفتح، ۴۸:۱۸) لیکن جب صلح حدیبیہ کی شرائط طے کی جارہی تھیں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر سے نہ دیکھنے کی وجہ سے صحابۂ کرام انہیں توہین آمیز سمجھ رہے تھے اور سخت رنجیدہ تھے۔ یہاں تک کہ سورۂ الفتح کی آیات نازل ہوئیں اور اللہ تعالیٰ نے اسے ''فتح مبین'' قرار دیا۔ صلح کے نتائج نے جلد ہی یہ ثابت کر دیا کہ یہ واقعی فتح مبین تھی۔ جو لوگ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ فلاں موقعے پر فلاں صحابی نے حضور کی خدمت میں عرض کیا کہ حضور! یہ فیصلہ آپ نے اپنے علم سے کیا ہے یا وحی کی بنیاد پر، اگر آپ نے اپنے علم سے ایسا کیا ہے تو اسے یوں کر لیجئے، اور اس صحابی کے مشورہ کو قبول کر لینے کی وجہ سے مسلمان فلاں نقصان سے بچ گئے یا انہیں فلاں فائدہ پہنچا، یا کہتے ہیں کہ فلاں موقعے پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فلاں فیصلے یا عمل پر آیتِ عتاب نازل ہوئی، انہیں سوچنا چاہئے کہ صحابۂ کرام میں سے کون تھا جس کے مشورہ سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انصار و مہاجرین کے درمیان مواخات جیسا معاہدہ کرایا جس کی کوئی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی، ان میں سے کس کے مشورہ پر آپ ﷺ نے میثاقِ مدینہ کے بارے میں سوچا۔ بیعتِ رضوان اور صلح حدیبیہ کا فیصلہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کس کی تجویز پر کیا! اسیرانِ جنگِ بدر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے مشورہ دیا تھا کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے انھیں فدیہ لیکر چھوڑنے، ان کی مالی استطاعت کو ملحوظ رکھتے

ہوئے انھیں رعایت دینے، تہی دامن قیدی جو پڑھنا لکھنا جانتے تھے، انھیں دس، دس مسلمان بچوں کو پڑھنا لکھنا سکھانے کی شرط پر رہا کرنے کا جو فیصلہ کیا گیا، اس کے بارے میں کہا جاتا ہے اللہ نے اسے سخت ناپسند فرمایا اور اس پر آیتِ عتاب نازل ہوئی۔ ۲۸ آیئے دیکھتے ہیں کہ اس آیتِ پاک میں کیا فرمایا گیا ہے۔

> ارشادِ ربّانی ہے: کسی نبی کی شان کے لائق نہیں کہ قیدیوں کو اپنے ہاں رکھیں حتیٰ کہ زمین میں انکا خون نہ بہائیں۔ تم لوگ اسبابِ دنیا چاہتے ہو اور اللہ آخرت چاہتا ہے اور اللہ عزّت والا حکمت والا ہے۔ اگر اللہ پہلے سے ایک بات کو لکھ نہ چکا ہوتا تو تم جو لینا چاہتے تھے، کے بدلے تمھیں بڑا عذاب پہنچتا۔ (الانفال، ۸:۶۷۔۶۸)

کیا اس کا یہ مطلب لیا جانا ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ جنگی قیدیوں کے بارے میں قیامت تک یہ قاعدہ مقرر فرمانا چاہتا تھا کہ انہیں قتل کر دیا جایا کرے! نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اللہ کی رضا کا جو علم تھا کیا وہ کسی دوسرے کو ہوسکتا تھا! قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہئے تھا، انھیں قید کرنے سے پہلے ان کا خون بہانے کے لئے کیا کرنا چاہئے تھا، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بہتر جاننے والا کوئی نہ تھا۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ساتھیوں کو علمِ الٰہی سے نوازنے کیلئے ان کا ارادہ پوچھا، لوگوں نے اپنی سمجھ کے مطابق جو مشورے دیئے ان کا مجموعی تاثر یہی تھا کہ لوگ اسبابِ دنیا کے طالب ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ بات سخت ناپسند ہوئی۔ قرآنِ پاک میں یہ شہادت موجود ہے کہ اللہ نے یہ لکھ دیا ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی موجودگی میں عذاب نہیں کیا جائے گا۔ (۸:۳۳) اور استغفار کرنے والوں پر عذاب نہیں کیا جائے گا۔ (۸:۳۳) چنانچہ حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی موجودگی کی بدولت اسبابِ دنیا چاہنے والوں کو یقیناً بڑے عذاب سے بچا لیا گیا۔ ۲۹ معلمِ کتاب وحکمت ہونا حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شان ہے۔ جنگی قیدیوں سے حسنِ سلوک کے حوالے سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے انسانیت کو وہ علم عطا فرمایا جس سے قیامت تک استفادہ فرمایا جاتا رہے گا۔

شاہد کی بات ہمیشہ غرض وغایت سے پاک ہوتی ہے اور بڑے علم سے ہوتی ہے۔ اسے وہ بھی علم ہوتا ہے جو مقتدی کو ہوتا ہے، اور وہ بھی ہوتا ہے جو اسے نہیں ہوتا۔ اسلئے بعض اوقات شاہد کی بات کی حکمت ماننے والوں کو سمجھ نہیں آتی، انھیں شاہد کی بات بالکل 'اوگن' (unjustified) لگتی ہے حالانکہ وہ عین 'گن' (virtue)

ہوتی ہے ۔(جیسے صلح حدیبیہ کے موقعہ پر ہوا۔) مقتدی جب شاہد کی بات کو اپنے علم کے پیمانے سے ناپتا ہے تو اسے حکم بجالانا مشکل ہو جاتا ہے۔شاہدین کو ماننے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی ہوتی ہے کہ ان کی بات سمجھ آئے تو بھی ماننا ہوتا ہے اور نہ سمجھ آئے تو بھی ماننا ہوتا ہے۔شاہد کے 'اوگن' کو 'گن' مانے بغیر شاہد کو مانا جا سکتا ہی نہیں ۔شاہد کا ماننے والا ،شاہد کی صداقت اور امانت کی شہادت دیکر ہی اس کے ماننے والوں میں داخل ہوتا ہے ۔اسکی اگلی بات کو بلا دلیل مان کر ماننے کا ثبوت دینا ہوتا ہے۔ ماننے کے بعد ہی جاننے کا مقام آتا ہے۔بلا شبہ یہ بہت بھاری مقام ہے،لیکن اس کے بغیر شاہد کی اطاعت اور اتباع کے مقام پر پورا رہنا ممکن نہیں ۔ حضرت میراں سید بھیکھ ایک بزرگ گزرے ہیں۔ پوربی زبان میں آپکا صوفیانہ کلام چھپا ہوا ہے۔'مالی' صاحب ان کے شاہد تھے ۔انھوں نے اسی بات کو بہت خوبصورتی سے اس طرح بیان فرمایا ہے:

بھیک، مالی کو اپنا جانو

'گن'، 'اوگن' کو 'گن' کر مانو

تب ہوئیا پار پرب جی، تب ہوئیا پار

آیئے دیکھتے ہیں قرآن پاک میں اسکا ذکر کہاں ہے۔سورہ الکھف میں ایک صاحب کا ذکر ہے جن سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملنے کا اشتیاق ہوا۔مسلم روایت میں یہ حضرت خضر علیہ السلام کے نام سے مشہور ہیں ۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا وہ ہمارے عباد میں سے ایک عبد ہیں جنہیں ہم نے اپنی رحمت اور علمِ لدنی (اپنے پاس سے ایک خاص علم) سے نوازا ہے ۔(۶۵:۲۲) ''حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آپ سے گذارش کی کہ میں آپ کا اتباع کروں، اس پر کہ آپ مجھے تعلیم فرمادیں گے جو علمِ رشد آپ کو عطا ہوا ہے۔'جواب دیا، آپ کیلئے میری معیت میں صبر کے ساتھ رہنا مشکل ہوگا۔۔۔کہا عنقریب آپ مجھے صابر پائیں گے۔'۔۔کہا، اگر آپ میرا اتباع کرتے ہیں تو کسی شےء کے بارے میں مجھ سے سوال نہ کیجئے حتیٰ کہ میں خود آپ سے اس کا ذکر کروں۔''(۶۶:۷۰)اب دونوں چلتے ہیں۔اس سفر میں تین واقعات پیش آتے ہیں ۔تینوں مقامات پر حضرت خضر علیہ السلام کا عمل انہیں خلاف حق نظر آیا۔بالخصوص جب آپ ایک لڑکے سے ملے اور حضرت خضر علیہ السلام نے اسے قتل کر دیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام بول اٹھے ''بے شک آپ نے ممنوعہ کام کیا ہے۔''اس بات کو جانتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے عباد میں سے ایک عبد فرمایا ہے جسے اس نے اپنی رحمت اور علمِ لدنی سے نوازا ہے،ان کے بظاہر خلاف حق عمل (اوگن) کو 'گن' مانتے ہوئے حضرت موسیٰ

علیہ السلام کواس یقین کے ساتھ خاموش رہنا چاہئے تھا کہ یہ مقام میرے احاطہء علم سے باہر ہے۔(تفسیر فاضلی، جلد چہارم، طبع دوم، ص۸۲۔۸۵) مگر وہ صبر نہ کر سکے۔ شاہدین کی بات بھی بڑے علم سے ہوتی ہے اور شاہد کو مان لینے کے بعد اس کے بظاہر 'اوگن' کو 'گن' مان کر ہی پورا رہنا ممکن ہوتا ہے ورنہ معیت ممکن نہیں رہتی۔ یہی بات ہے جسے حضرت میراں سید بھیکھ نے اپنے خوبصورت اشعار میں بیان کیا ہے۔شاہد کے ہر عمل کا حوالہ قول کی صورت میں اللہ کا فرمان ہوتا ہے، اس فرمان پر عمل کی طریقت کا حوالہ اسکا اپنا شاہد ہوتا ہے۔اسکی اپنی کوئی بات نہیں ہوتی۔

تصوف بطور احسانِ اسلام

صوفیاء اور مقاصدِ تصوف کو دین کے عین مطابق سمجھنے والے علماء کرام کے لئے یہ مسئلہ ہمیشہ رہا ہے کہ اسلامی تعلیمات میں اس کا ماٴخذ کہاں تلاش کریں جبکہ قرآنِ کریم میں کہیں سے بھی 'تصوف' یا 'صوفی' کا لفظ اخذ کرنا ممکن نہیں۔معاصر صوفیاء اور علماء کرام کی اکثریت جنہیں پڑھنے کا مجھے اتفاق ہوا ہے، تصوف کی بنیاد حدیثِ جبرائیل میں تلاش کرتی نظر آئی ہے۔اس حدیث کی بنیاد پر وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام، ایمان، اور احسان ماننے کے تین درجے(three levels of believing) ہیں۔زبان سے اقرار کرنا اسلام ہے، دل سے تصدیق کرنا ایمان ہے، اور اس یقین سے عمل کرنا کہ میں اللہ کو دیکھ رہا ہوں اور اگر یہ درجہ میسّر نہ ہو تو یقین رکھنا کہ اللہ مجھے ضرور دیکھ رہا ہے، احسان ہے۔اس نظریہ کے حامی دعویٰ کرتے ہیں کہ احسان کا مقام 'ماننے کے درجے' کے اعتبار سے سب سے بڑا ہے، اور عرفِ عام میں جسے صوفی کہا جاتا ہے، ماننے کے اعتبار سے احسان کے مقام پر ہوتا ہے۔[۳۰]

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری اپنی کتاب 'سلوک وتصوف کا عملی دستور' میں تصوف کو تزکیہ و احسان کے نظام سے موسوم کرتے ہیں۔[۳۱] سیّد حسین نصر اور آپ کے مکتبہء فکر سے تعلق رکھنے والے تمام لوگ تصوف کا جواز اسی حدیث میں تلاش کرتے ہیں۔ولیم سی چٹک اور مراتا چٹک کی کتاب The Vision of Islam کا بہت بڑا حصہ تو مشتمل ہی اسی حدیث کے مضمرات اخذ کرنے پر ہے۔اس حدیث کا متن اس طرح ہے: ''حضرت عمر بن الخطّاب سے روایت ہے کہ ایک دن ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ ایک شخص ہمارے سامنے سے نمودار ہوا۔اس کا لباس انتہائی سفید تھا اور بال انتہائی سیاہ۔اس پر سفر کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا تھا، اور ہم میں سے کوئی اسے پہنچانتا بھی نہیں تھا۔(وہ چلتا ہوا آیا) یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھٹنوں سے گھٹنے ملا کر بیٹھ گیا اور اپنے ہاتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زانو پر

رکھدئے اور کہا: 'اے محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مجھے اسلام کے بارے میں بتائیں۔' رسول اللہ نے فرمایا: 'اسلام یہ ہے کہ تم گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی الہٰ نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، اور یہ کہ نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو اور اگر وہاں جانے کی استطاعت ہو تو حج بیت اللہ کرو۔'

وہ بولا: 'آپ نے سچ کہا' ہمیں یہ بات عجیب لگی کہ یہ شخص آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے سوال کرتا ہے ا ور پھر تصدیق بھی کرتا ہے کہ آپ نے سچ کہا!

(اس کے بعد) اس نے کہا: 'اب مجھے بتایئے ایمان کیا ہے۔' آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: 'ایمان یہ ہے کہ تم ایمان لاؤ اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اسکی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر اور یومِ آخر پر، اور یہ کہ تم یقین رکھو تقدیر پر اور اس کے خیر و شر پر۔' 'سچ کہا آپ نے' اس نے کہا اور پھر استفسار کیا: 'اب مجھے بتایئے کہ احسان کیا ہے۔'

آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: 'احسان یہ ہے کہ اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے تم اسے دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگر چہ تم اسے نہیں دیکھ رہے لیکن وہ تمھیں دیکھ ہی رہا ہے۔'

پھر اس شخص نے پوچھا: 'مجھے قیامت کے بارے میں بتایئے۔' آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: 'جس سے پوچھا جا رہا ہے، وہ خود پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا۔'

اس نے کہا: 'مجھے اس کی نشانیاں بتا دیجئے۔' آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: 'کنیز اپنی مالکہ کو جنم دے گی اور تم دیکھو گے کہ جن کے پاؤں میں جوتا ہے نہ تن پر کپڑا، بھوکے ننگے اور بھیڑ بکریاں چرانے والے عمارتیں کھڑی کرنے کی دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کریں گے۔''

حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد وہ شخص رخصت ہو گیا۔ میں خاصی دیر تک منتظر رہا، آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: 'اے عمر! تمھیں معلوم ہے کہ وہ سوال کرنے والا کون تھا!' میں نے عرض کیا: 'اللہ اور اسکے رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔' آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: وہ جبرئیل تھے تمھیں تمھارا دین سکھانے آئے تھے۔''[۳۲]

اس تمام واقعے کی حقیقت سے قطع نظر، قرآنِ پاک کی سند کے ساتھ پورے یقین سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ 'احسان' کا لفظ اسلام اور ایمان کی طرح، قرآنِ پاک میں کسی بھی مقام پر ماننے کے درجے (level of believing) کے طور پر نہیں آیا۔ اسی طرح، اللہ اور اسکے رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے معروف کا حکم دیا ہے اور منکر سے منع کیا ہے۔ معروف کے تین ہی درجے ہو سکتے ہیں: عبادت، سخاوت، اور خدمت۔ عبادت،

عبدیت کا محض ایک رکن ہے۔ قرآنِ پاک میں 'احسان' کا لفظ عبادت کے مفہوم میں کہیں آیا ہی نہیں۔ احسان کا تعلق عمل کے ساتھ ہے۔ اللہ کی رضا کو مقصود رکھتے ہوئے، کسی کو اس کے حق کی ادائیگی میں آسانی مہیا کرنا احسان ہے۔قرآنِ پاک میں والدین پر بھی احسان کا حکم ہے۔جسے احسان کرنے کا شرف ہوا سے استفادہ کرنے والے کا شکریہ بھی ادا کرنا چاہئے کہ مستفید ہونے والے کی بدولت ہی محسن کو فانی شئے کے بدلے دائمی انعام ملتا ہے۔سخاوت عمل ہے۔خدمت عمل ہے۔خدمت کا درجہ سب سے بڑا ہے۔ڈاکٹر اسرار احمد، جنہوں نے اپنے کتاب 'تصوف یعنی احسانِ اسلام' میں کہا ہے کہ صوفی درجۂ اعتقاد کے اعتبار سے احسان کے مقام پر ہوتا ہے، ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس بات کو قرآنِ پاک کی سند سے ثابت نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی انھوں نے اس کیلئے قرآنِ پاک سے کوئی سند نقل کی ہے۔کیا ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے اپنے عمل سے اس کی کوئی تصدیق ملتی ہے! ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ایک بہت قریبی ساتھی سے میں نے استفسار کیا کہ کیا ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے کسی صوفی کو 'احسان' کے مقام پر پایا اور اسکی اطاعت، اتباع اور تصدیق سے ماننے کا یہ اعلیٰ ترین درجہ پایا! ان کا جواب تھا: ''نہیں۔ڈاکٹر اسرار احمد کہتے ہیں کہ میں نے دنیا کے بہت سے ممالک کا سفر کیا ہے، لیکن مجھے کوئی ایسا شخص ملا نہیں جس کی میں بیعت کر لیتا۔اب میں نے قرآنِ پاک پر ہی بیعت کر لی ہے۔'' مطلب یہ کہ میں نے اپنے ہی فہمِ قرآن کو سند مان لیا ہے، اور اپنے سے بڑھ کر اللہ کی طرف رجوع لانے والا مجھے کوئی ملا نہیں جس کا میں اتباع کر لیتا۔

ڈاکٹر اسرار احمد اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایمان کے دو درجے ہیں: ایک قانونی ایمان اور دوسرا حقیقی ایمان۔قانونی ایمان کے درجے میں عمل علیحدہ ہے ایمان سے جبکہ حقیقی ایمان کے درجے میں عمل جزوِلا ینفک بن جاتا ہے ایمان کا۔اور پھر اس سے اوپر تیسرا درجہ احسان کا ہے۔۳۳ ڈاکٹر اسرار احمد اہلِ تصوف کے مقاصد کو صد فیصد دین سمجھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ان کا نظریہ ہے کہ تصوف کا اصل تانا بانا قرآن مجید کے محکمات پر قائم ہے۔اس میں وہ تصوف کے فلسفیانہ حصہ کو بھی شامل سمجھتے ہیں۔یہ صوفیاء کو اسلام کے اصل فلسفی قرار دیتے ہیں۔۳۴ حضرت فضل شاہ اور حضرت محمد اشرف فاضلی صاحب کا فرمان ہے کہ مسلمان کی دو نشانیاں ہیں: اسکی زبان پاک اور ہاتھ امین ہوتا ہے۔دعویٰ تسلیم کی بنیاد ایمان بالغیب ہے۔جس کی صداقت کی شہادت دی جائے، جس کی امانت کی شہادت دی جائے، اسکی بات کو بلا دلیل ماننا ایمان بالغیب ہے۔ان حضرات کا یہ بھی فرمان ہے کہ جس قول کا عمل شاہد نہ ہو وہ سچا ثابت نہیں ہوتا۔یہ بھی فرمایا کہ دعویٰ بلا شہادت قابلِ سماعت ہی نہیں ہوتا۔ایمان بالغیب کے بعد ایمان بالشہادت کا مقام ہے۔مثلاً حضور صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے: بے شک اللہ کے ذکر میں ہی اطیمنانِ قلب ہے ۔(۲۸:۱۳) شاہد سے ذکر کا طریقہ سیکھنے کے بعد جب ماننے والے پر اطیمنانِ قلب کا مقام آتا ہے تو ایمان بالغیب، ایمان بالشہادت کے درجے میں آجاتا ہے۔ یہ علم کا مقام ہے۔ اللہ کے فضل سے اگر مشاہدے کا شرف نصیب ہو تو اس سے ایمان میں رفعت آتی ہے۔ ماننے والے کے ذمّے یہی ہے کہ وہ قول، عمل، اور علم تینوں مقامات پر شاہد کے اتباع میں پورا رہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد لکھتے ہیں کہ انسانی شخصیت کے اندر دو متحارب اور باہم مخالف اور متضاد عناصر اسکا نفسِ حیوانی اور اس کی روحِ ملکوتی ہیں، اور کرنے کا اصل کام یہ ہے اور ہر انسان پر لازم ہے کہ روحانی عنصر کی تقویت وتغذیہ کا سامان کیا جائے اور دوسری طرف حیوانی عنصر کی تہذیب وتزکیہ کا بندوبست کیا جائے ۔روح کی تقویت وتغذیہ کیلئے وہ ذکرِ الٰہی تجویز کرتے ہیں۔ ''سب سے بڑا ذکر خود قرآن ہے، پھر نماز اور پھر ادعیہ واذکارِ مسنونہ۔ اس سے تجلیۂ روح کا مقصد حاصل ہوگا اور ایمان کی شدّت اور گہرائی میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا، یہاں تک کہ انسان منزلِ 'احسان' کو پالے گا۔''۳۵ تہذیب وتزکیۂ نفس کیلئے مخالفتِ نفس کی کیا ریاضتیں اختیار کی جائیں، اس کیلئے سب سے پہلی چیز اقامتِ صلوٰۃ ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ یعنی نماز کو اس طرح قائم کرنا کہ کوئی مصروفیت، کوئی دوستی، کوئی کاروبارِ دنیوی، طبیعت کی غیر آمادگی، موسم کی شدّت، غرض کوئی چیز آڑے نہ آنے پائے، اور نمازِ تہجد کیلئے تو نیند کو بھی قربان کرنا پڑتا ہے۔ پھر روزہ ہے۔ پھر انفاقِ مال ہے۔ ان سے مخالفتِ نفس کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد مزید لکھتے ہیں کہ یہی مقصد دو اور فرائض یعنی حج، اور دعوتِ دین اور اقامتِ دین کی جدوجہد کے ذریعے بھی پورا ہوتا ہے، یہ دو فرائض دراصل ان تینوں کے جامع ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد کہتے ہیں کہ مخالفتِ نفس کی ان ریاضتوں میں سے ترجیح کا اصول یہ ہے کہ ''اگر اللہ کا دین غالب ہے اور اسلامی ریاست موجود ہے تو مخالفتِ نفس کیلئے اقامت الصلوٰۃ، صوم، انفاق، اور حج کے ذرائع اختیار کیجئے، اور اگر اللہ کا دین پامال ہو رہا ہے تو.... اقامتِ دین کی جدوجہد کو تمام نفلی عبادات پر فوقیت حاصل ہو جائے گی۔'' اس کے بعد مزید کہتے ہیں: ''کہ خدمتِ خلق کی تین منزلیں ہیں۔ پہلی منزل ہے بھوکوں کو کھانا کھلانا، ضرورت مندوں کی امداد کرنا۔ اور ایک داعیِ حق کیلئے یہ چیز نہایت ضروری ہے ورنہ اسکی دعوت دوسروں تک نہیں پہنچ پائے گی۔ دوسری منزل ہے خدمتِ خلق کے حوالے سے لوگوں کی عاقبت سنوارنے کی کوشش کرنا، اللہ کی طرف دعوت دینا۔ اس سے بڑی کوئی خدمت خلق نہیں ہوسکتی کہ انسان دوسروں کی ابدی زندگی کی فلاح کے لئے کوشش کرے۔ خدمتِ خلق کی تیسری منزل یہ ہے کہ خلقِ خدا کو ظالمانہ نظام کے جبر واستحصال سے نجات دلانے کی کوشش کی جائے۔ صرف پہلی قسم کی خدمتِ خلق کو کل سمجھ لینا دراصل دین کے محدود تصور کا شاخسانہ ہے۔''۳۶

روح کے بارے میں قرآنِ پاک میں فرمایا گیا ہے کہ یہ اللہ کے امر کی چیزوں سے ہے۔اور یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ تمھیں اس کا علم قلیل ہی دیا گیا ہے۔(۸۵:۱۷) قرآنی وجودیات (Quranic Ontology) کے مطابق جس کو بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے ہستی سے نوازا گیا ہے، وہ خلق کی کیٹیگری سے تعلق رکھتا ہے یا امر کی کیٹیگری سے۔(۵۴:۷) درج بالا آیۂ کریمہ میں روح کے بارے میں ارشاد ہو رہا ہے کہ یہ 'امر' کی کیٹیگری سے تعلق رکھتی ہے۔انسان روح کے بارے میں جتنی بھی تحقیق کر لے قرآنِ پاک شاہد ہے کہ اس کے بارے میں انسان کا علم ہمیشہ قلیل ہی رہے گا۔لیکن ایک بات طے ہے کہ نہ تو خلق کسی بھی درجے میں اللہ کی الوہیت میں شریک ہے اور نہ ہی امر۔ڈاکٹر اسرار احمد بھی اس کو مانتے ہیں لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ ''صادر تو وہیں سے ہوئی ہے۔''اس کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں ''بعض عارفین نے جو مثال دی ہے وہ یہ ہے کہ ہماری روح کا ذاتِ باری کے ساتھ وہی تعلق ہے جو سورج کی کرن کا سورج کے ساتھ ہوتا ہے۔''۳۷ سورج اور کرن کا رشتہ علت اور معلول کا رشتہ ہے۔معلول کے علت سے صادر ہونے میں کہیں علت کے ارادہ کو دخل نہیں ہوتا۔معلول اپنی نیچر کے اعتبار سے علت سے مختلف نہیں ہوسکتا۔اگر عارف سے مراد وہ ہے جسے معرفتِ ربی سے نوازا گیا، تو کیا وہ خدا اور روح کے تعلق کے حوالے سے بے سند بات کرے گا! ڈاکٹر اسرار یہ بھی کہتے ہیں کہ امرِ ربّ ہونے کے اعتبار سے روح اندھی اور بہری تو نہیں ہوسکتی لیکن سوئی ہوئی ہوتی ہے، اللہ کا ذکر اسے بیدار کرتا ہے۔۳۸ جو لوگ قرآن کے عالم ہونے کے دعویدار ہوتے ہیں ان سے بجا طور پر توقع کی جاتی ہے کہ وہ سند کے ساتھ بات کریں گے۔کیا روح کے خفتہ ہونے (dormant) اور پھر 'ذکر' کے ذریعے بیدار ہونے کا کوئی بیان قرآنِ پاک میں ہے؟ ہرگز نہیں۔ڈاکٹر صاحب نے ایک اصطلاح 'تحریر الرّوح' وضع کی ہے جس کے معنی انھوں نے خود حریّتِ روح (liberation of the soul or spirit) بیان کیے ہیں۔ان کا کہنا ہے''۔۔۔نفسِ حیوانی کا غلبہ جتنا شدید ہوگا اسی قدر ہماری روح ان بیڑیوں میں مقید رہے گی اور نفسِ حیوانی کا غلبہ جتنا کمزور پڑے گا اسی تناسب سے روح کو آزادی ملے گی۔تہذیب وتزکیۂ نفس کا نتیجہ تحریر الرّوح کی شکل میں نکلتا ہے یعنی روح درحقیقت نفسِ امّارہ کے تسلط سے آزاد ہوتی ہے۔''۳۹ روح کے قید ہونے کا یا بیڑیوں سے آزاد ہونے کا کوئی تصور قرآنِ پاک میں نہیں ملتا۔روح مضمحل بھی نہیں ہوتی کہ اسے ذکر کے ذریعے تغذیہ فراہم کرنے کی ضرورت ہو۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ 'تحریر الرّوح' ایک بے سند اصطلاح ہے اور میری تحقیق کے مطابق مسلم فلسفہ وکلام اور تصوف کے مسائل کی بہت بڑی وجہ غیر قرآنی اصطلاحات کو وضع وقبول ہے۔

(جاری ہے.....)

حوالہ جات

۲۰۔ڈاکٹر اسرار احمد، ’’خلافت کے اقتصادی نظام کی اصولی اساس‘‘ ندائے خلافت، جلد اول شمارہ ۴۔۵، ۱۹۹۲ء، ص ۱۰

۲۱۔ایضاً

22- Maulana Waheedudin Khan, Islam on Secular Science, The Milli Gazette, Vol. 2 No. 16 www.milligazette.com/Archives/15082001/26.htm

۲۳۔تفسیر فاضلی جلد اوّل، سوم، تعارف

۲۴۔ڈاکٹر نعیم احمد، ایامِ حبیب ﷺ، شعبہ فلسفہ پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۲۴، ۱۶، ۱۷۔

۲۵۔نعیم احمد، ایضاً، ص ۴۹۰

۲۶۔تفسیر فاضلی منزل ہفتم، ۱۹۹۸ء، ص ۶۹۔۳۶۸،

۲۷۔تفسیر فاضلی، جلد ششم، ۱۹۹۷ء، ص ۹۴۔۳۹۳

۲۸۔نعیم احمد، ایضاً، ص ۵۰۴

۲۹۔تفسیر فاضلی منزل دوم ۱۹۹۰ء، ص ۶۶۔۳۶۵

30- Dr. Ahmed Afzaal, "Rendezvous in Orlando", *The Quranic Horizens*, October-December 1998, Lahore: Markzi Anjuman Khddam-ul-Qur'an,p.7

۳۱۔شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری، سلوک و تصوف کا عملی دستور، لاہور، منہاج القرآن پبلیکیشنز، ۲۰۰۹ء، ص ۱۴۔۱۱

۳۲۔ولیم سی چٹک، ومراتا چٹک، اسلام اپنی نگاہ میں، مترجم محمد سہیل عمر، لاہور، اقبال اکیڈمی پاکستان، ۲۰۰۹ء ص ۲۷۔۲۶

۳۳۔ڈاکٹر اسرار احمد، مروجہ تصوف یا سلوکِ محمدی؟ یعنی احسانِ اسلام!، تنظیمِ اسلامی، جون ۱۹۹۷ء، ص ۱۳۔۱۲

۳۴۔ایضاً، ص ۴۳

۳۵۔ایضاً

۳۶۔ایضاً، ص ۲۹۔۲۶

۳۷۔ایضاً، ص ۲۰

۳۸۔ایضاً

۳۹۔ایضاً، ص ۱۹